رات مجھے اچھی لگتی ہے
رخشندہ نوید
رخشندہ نوید
رات مجھے اچھی لگتی ہے
روشنک

رات مجھے اچھی لگتی ہے

انتساب

شہزادوں کے نام

اے شہزادو، نیکی زادو!
کیا تم سب کو ایک ہی کوکھ نے جنم دیا ہے
الگ زمینوں سے تم چل کر، اپنا اپنا دانہ چن کر
مرے صحن کے دالانوں میں
ہرے بھرے اشجار کی صورت مہک رہے ہو
تم میں سے ہر اک شہزادہ
لکھا ہوا مرے رب کا وعدہ
تم سب کو ہی رب نے کون سی مٹی چن کر خوب بنایا
مری حسیں پریوں کے لیے محبوب بنایا
چار طرف سے خیمے کو کچھ اور بھی مضبوطی سے باندھو!
اے شہزادو، نیکی زادو!

فہرست

حمد

شمارِ رحمتِ ربّی ہو ، وہ عدد نہیں ہے
میں حمد کیسے لکھوں اتنا میرا قد نہیں ہے

پناہ دیتا ہے وہ ذوالجلالِ والاِکرام
کہ اِس جناب میں تفریقِ نیک و بد نہیں ہے

وہ سب کی جھولیاں بھرتا ہے سب کا رب جو ہوا
اُسی کا در ہے جہاں مانگنے کی حد نہیں ہے

وہی ہے رازق و مالک، نہیں کوئی ذی روح
کہ جس کے واسطے اللہ کی مدد نہیں ہے

ہر ایک اس کا ہے محتاج، بے نیاز ہے وہ
الٰہ کیسے وہ ہو گا کہ جو صَمد نہیں ہے

عیاں ہیں تجھ پہ الٰہی مرے عیوب تمام
جواز کیا کہ مرے عذر کی سند نہیں ہے

ظہورِ ہستی پہ نازاں تو ہے سبھی مخلوق
مگر بمثلِ بشر کوئی خال و خَد نہیں ہے

ہر اک کو چاہیے قرآن کھولے، رخشندہ
سوا خدا کے یہاں کوئی بھی اَحد نہیں ہے

نعتؐ

جب صدا گونجی اذاں کی روزِ اوّل کان میں
تب نبی کی نعت بھی شامل ہوئی ایمان میں

مالِ دنیا کی ضرورت کم رہی سامان میں
رُخصتی کے وقت تھی میں سایۂ قرآن میں

ذکرِ آقا روز و شب کرنے سے اندازہ ہوا
پھول کھِل جاتا ہے کیسے ایک غنچہ دان میں

اِک سہولت سے کٹے گا زندگی کا ہر سفر
حرف چُن کر لایئے اپنے نبیؐ کی شان میں

جب بھی پھیلایا نبیؐ کے سامنے دامانِ دل
وہ ہوا سوچا نہیں تھا، جو کبھی اِمکان میں

عشقِ نورِ پاک سے آنکھیں منوّر کیا ہوئیں
روشنی جاگ اُٹھی میرے جسم میں،اور جان میں

نعتؐ

آپ کی شان میں بدگوئی جو مردود کرے
ربِ کامل اسے اس دنیا میں محدود کرے

مجھ گنہگار کو درکار ہی کیا ، سجدہ قبول !
سر اٹھا لینے سے پہلے مرا مسجود کرے

اپنی من چاہی تمناؤں سے خود خائف ہوں
جو مرے حق میں ہے بہتر مرا معبود کرے

وہ شہہِ والا، وہ داتا ، وہی اُمت کا امیں
سب کی قسمت میں وہی منزلِ مقصود کرے

اس کرشمے نے ہمیشہ مجھے حیران رکھا
وہ ہر اک مانگنے والے پہ کرم زود کرے

سوچ کعبے کی رکھیں، اور نظر میں قرآن
کیا مجال اس پہ اثر آتش نمرود کرے

نعتؐ

نثار ایک نہیں صرف میری جاں اُنؐ پر
زمیں کے ساتھ فِدا سات آسماں اُنؐ پر

یہ میں نے دیکھا کہ دیوانہ وار شام و سحر
درود بھیجتی رہتی ہے میری ماں اُنؐ پر

بس ایک عشق کہ ہے قدرِ مُشترک اُن میں
مٹے ہیں چاہنے والے یہاں، وہاں اُنؐ پر

وہاں، وہاں شہِ والا گُلاب رکھتے گئے
اٹھائے کفر نے پتھر جہاں، جہاں اُنؐ پر

نہیں کہ ایک وہ ہجرت کے کرب سے گزرے
پھر اُس کے بعد بہت آئے امتحاں اُنؐ پر

کچھ اس قدر ہے مکمل وہ ذاتِ والا صفات
کہ ختم ہونے لگی طاقتِ بیاں اُنؐ پر

میں روتی جاؤں نبیؐ جی، نبیؐ جی کہتے ہوئے
یقین ہے کہ مرا درد ہے عیاں اُنؐ پر

نعتؐ

پہنچے سرِافلاک یہ فریاد ضروری
اے سرورِ کونینؐ ہے امداد ضروری

جب پیش حضوری میں کرو اپنی خطائیں
جی بھر کے ہے رونا دلِ برباد ضروری

نام اپنا بھی آجائے فقیروں میں کسی دن
ہم ایسے غلاموں کو ملے داد ضروری

میلادِ نبیؐ سجتا رہے گوشۂ دل میں
معبد کو سدا رکھنا ہے آباد ضروری

اس عشق میں بن مانگے ملے قُلزمِ انوار
اس عشق میں کب تیشۂ فرہاد ضروری

ہر سلسلۂ زیست رواں ذکرِ نبیؐ سے
کرتی رہوں ہر لمحہ انہیںؐ یاد ضروری

ہم لوگ جو بکھرے ہیں، تو یہ بھول گئے ہیں
لشکر کو کہاں چاہیے تعداد ضروری

○

نہ جانے کس طرف اب یار لوگ رہتے ہیں
سمندروں کے کہیں پار لوگ رہتے ہیں

یہ اتنا شور یہاں کا تو ہو نہیں سکتا
ہمارے گھر میں تو دو چار لوگ رہتے ہیں

ہَوا اڑا کے مجھے لے بھی چل اُسی جانب
اُدھر، جہاں مرے دِل دار لوگ رہتے ہیں

یہ دل کی بستی تھی کوئی جلانے آیا تھا
میں چیخ اُٹھی خبردار ، لوگ رہتے ہیں

عجیب دنیا ہے میری سمجھ سے بالاتر
ہر ایک سمت ہی دشوار لوگ رہتے ہیں

سمندروں سے بھی شفّاف ، آسماں سے عمیق
کہیں ، کہیں تو چمک دار لوگ رہتے ہیں

رہیں اک ایسے علاقے میں چل کے، رخشندہؔ!
جہاں ہمارے طرف دار لوگ رہتے ہیں

O

دل کو آباد کیوں نہیں کرتے
تم ہمیں یاد کیوں نہیں کرتے

ڈھونڈتے ہو سکونِ دِل اکثر
طائرِ آزاد کیوں نہیں کرتے

درد محسوس کیوں نہیں ہوتا
کوئی فریاد کیوں نہیں کرتے

ٹوٹ کر گر رہے ہیں تارے کیوں
پوری میعاد کیوں نہیں کرتے

□

عشق پھر سے زمین بوس ہوا
گہری بنیاد کیوں نہیں کرتے

ایسے بجھتی ہے انتقام کی آگ
اس کو برباد کیوں نہیں کرتے

بن سکیں آنسوؤں کے ہار ، ایسا
تار ایجاد کیوں نہیں کرتے

O

ڈھونڈنا، ملنا، بچھڑنا کبھی کھونا رُک جائے
یہ جو ہوتا ہے طبیعت میں یہ ہونا رُک جائے

غم کی بد روح سے کچھ اور توقع کیا ہو
رات کے پچھلے پہر اس کا یہ رونا رک جائے

پھر وہی ماہ گزشتہ سے نہ ہوں گے حالات
پھر کہیں بچے کا اس بار کھلونا رک جائے

مرض اس دل کا لیے پھرتا ہے آزار کئی
کھانا ،پینا نہ رہے چین سے سونا رک جائے

عشق کا تذکرہ پھر کون کرے دنیا میں
دل کی کھیتی میں اگر درد کا بونا رک جائے

داستاں یوں ہو قلمبند کہ پھر رخشندہَ
جو ترے ساتھ ہوا، اوروں سے ہونا رک جائے

O

خوف کا شہر ہے اور شہر بدر ہوتے ہی
مار ڈالوں نہ کسی کو مَیں نڈر ہوتے ہی

کُھل کے جینے میں یہی خوف، خلل ڈالتا ہے
رات اک اور بھی ہے رات بسر ہوتے ہی

اِن پرندوں کا کوئی اور بھی ہوتا ہے پیام
جاگ تو جاتی ہوں ہر روز سحر ہوتے ہی

میرے اندر سے کوئی جُھوم کے نکلا باہر
تیرے اس شہر میں آنے کی خبر ہوتے ہی

میں بھی دانوں سے بھری تھالی اٹھائے نکلی
شور سے بھر گیا دالان سحر ہوتے ہی

ڈر یہی رہتا ہے ٹہنی کو جواں ہونے پر
کاٹ کر پھینک نہ دے کوئی شجر ہوتے ہی

O

تیز کچھ اور تیز چاہیے تھا
وقت ہنگامہ خیز چاہیے تھا

دشمنوں سے ملا کے ہاتھ ہمیں
دوستوں سے گُریز چاہیے تھا

میں نے غربت میں آنکھ کھولی تھی
اس کی ماں کو جہیز چاہیے تھا

کچھ لُغت سے ہی دیکھ لیتے کبھی
چاہیے تھی کہ میز چاہیے تھا

□

اس تعفن بھرے زمانے میں
ایک پل عِطر بیز چاہیے تھا

شکر کے طور پر یہ تیرا سَر
ہر گھڑی سجدہ ریز چاہیے تھا

پھر سے، رخشندہؔ غور کر لیجے
شعر اک معنی خیز چاہیے تھا

○

دل کی بربادی نہ ہو جاں کا خسارہ نہ کریں
مشورہ دوست کا ہے، عشق دوبارہ نہ کریں

روشنی کرتا چلا جاتا ہے اک یاد کا دیپ
رات کٹ جائے گی رو کر تو گزارا نہ کریں

ریل کی پٹڑی پہ مایوسی کا جب پاؤں پڑے
ایسے حالات میں کیا رب کو پکارا نہ کریں

ہاتھ لے جائیں نہ اِن ہونٹوں کی جانب اپنے
بزم میں بیٹھے ہوئے یوں تو اشارہ نہ کریں

ہم مسافر ہیں ہمیں بھولنے لگتی ہے گلی
اپنی آنکھوں سے کہیں پیچھا ہمارا نہ کریں

○

بے ثمر لمحہ نمو میں آ گیا
ذِکر تیرا گفتگو میں آ گیا

اک خیالی شاہزادے کی طرح
ماہتاب اُترا سبُو میں آ گیا

شکر کر بے نام رہنے والے شخص
تو ہماری جستجو میں آ گیا

عکس پاکیزہ خیالوں کی طرح
اِک نمازی کے وضو میں آ گیا

وہ نہتّا سامنے آیا مرے
اعتماد اتنا عدو میں آ گیا

ہاتھ تھامے ہم ٹہلنے لگ گئے
عِطر خود ہی رنگ و بُو میں آ گیا

O

اپنی قیمت بڑھا کے دیکھا تھا
اس کو دل میں بٹھا کے دیکھا تھا

سرمئی آدھے ، آدھے کالے بال
ایک دن پاس جا کے دیکھا تھا

اس کو چھونے کی آرزو پیہم
ہاتھ دونوں بڑھا کے دیکھا تھا

بزم میں جس طرف نظارے تھے
پُوری کرسی گھما کے دیکھا تھا

ماہتاب اتنی دُور تھا ہم سے
بادلوں کو ہٹا کے دیکھا تھا

دیکھ سکتی تھی گُھپ اندھیرے میں
کب دیے کو جلا کے دیکھا تھا

سانولا ، سانولا ہوا سب کچھ
جب بھی کاجل لگا کے دیکھا تھا

پھر کہیں دیکھ پائی قامت کچھ
اُس کو ایڑی اُٹھا کے دیکھا تھا

لوگ پتھر کے ہوتے جاتے تھے
جس کو بھی مسکرا کے دیکھا تھا

دیکھا، اس کو ، نہ کوئی دیکھ سکے
کالا چشمہ لگا کے دیکھا تھا

کس قدر لوگ دیکھتے ہیں اُسے
اپنی آنکھوں سے جا کے دیکھا تھا

○

وہ اپنی چل تو چکے چال پوچھتے کیوں ہیں
زِرہ ہے کوئی، کوئی ڈھال پوچھتے کیوں ہیں

سب اچھا کہتے ہوئے آنکھ تو اٹھائی نہیں
یہ لوگ مجھ سے مرا حال پوچھتے کیوں ہیں

جو ہونے والی ہے اُس موت کا برس پوچھیں
میں جس میں پیدا ہوئی سال پوچھتے کیوں ہیں

کہیں کہیں تو ہُوا زلف کو وہ لمس نصیب
ہوا نے کیسے چھُوئے بال پوچھتے کیوں ہیں

یہ اُن کا خاص وطیرہ ہے، ان کی عادت ہے
عدو نے پھینکا ہے پھر جال پوچھتے کیوں ہیں

انہیں تو علم ہے کب آنکھیں ہوتی ہیں لبریز
یہ آنسوؤں سے بھرے گال پوچھتے کیوں ہیں

شہید کون تھے اب جا کے ہم بتائیں انہیں
وہ اپنی ماؤں کے تھے لال پوچھتے کیوں ہیں

O

ستارہ ہاتھ میں آیا نہیں کمند کریں
اب اور کتنا بھلا حوصلہ بلند کریں

ہر ایک حال میں تُو سامنے ہی رہتا ہے
یہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ آنکھیں بند کریں

ہزار چہرے ان آنکھوں کو پیش کر ڈالے
تمھارے بعد کسی اور کو پسند کریں

سنائیں کس کو فسانہ جو داستان ہوا
ہزار قصوں کو کوزے میں کیسے بند کریں

وطن کو گھر ہی نہ جانیں، تمام ایسے لوگ
یہاں سے جائیں، کہیں اور جا کے گند کریں

O

باتیں کریں جو مجھ سے مہرباں کے ہونٹ ہوں
ایسے نہ ہوں کہ پہرے پہ درباں کے ہونٹ ہوں

سختی سے بند دیکھ کے دروازے یوں لگا
جیسے کسی مرے ہوئے انساں کے ہونٹ ہوں

جب بھی چھُوئے گلابی کہیں دیکھ کر گلاب
ہر پھول یوں لگا کہ گلستاں کے ہونٹ ہوں

میں چاہتی ہوں پھر سے گلے اس کے لگوں
پھر سے وہ ماتھا چُومے، مری ماں کے ہونٹ ہوں

ان راستوں پہ دیکھی، سنی گھنٹیوں کی چیخ
ممکن ہے دشت میں وہ حُدی خواں کے ہونٹ ہوں

O

اشک پیتے ہوئے حد درجہ حسیں لگتی ہوں
مُسکرانے کے سبب خندہ جبیں لگتی ہوں

کیسے ممکن ہے، سرِ شاخ، اُگوں از سرِ نو
میں کوئی بیج ہوں، کیا زیرِ زمیں لگتی ہوں

کیوں مجھے چھوڑ کے جانے کو ہوئی ہے بے تاب
زندگی ! کیا میں تجھے اچھی نہیں لگتی ہوں

روز ملتے ہیں سرِراہ گداگر جنھیں میں
کسی آسودہ علاقے کی مکیں لگتی ہوں

ٹوٹنا دل کا اسی ضرب سے ہو گا منسوب
زخم ہوں اور ہر اک بار وہیں لگتی ہوں

خالی کمرے میں کہاں ہوتی ہے چھپنے کی جگہ
نقشِ دیوار کی صورت ہی کہیں لگتی ہوں

O

نہ جانے پانی کی رہتی ہے کیوں کمی مجھ میں
ان آنسوؤں کی کبھی جذب ہو نمی مجھ میں

اب ایک جیسا ہی لگتا ہے دونوں کا احساس
کچھ ایسے ہو گئی یک جا خوشی ،غمی مجھ میں

اِسے مٹانے میں نفرت نہ میرے کام آئی
یہ کیسی پختہ محبت سی ہے جمی مجھ میں

ہر ایک درد کا کرتی ہوں نفسیاتی علاج
تو ٹھنڈی پڑنے لگی خود سے برہمی مجھ میں

گھڑی کی چھوٹی سوئی رُک گئی کہیں شاید
صدا اسی کی ہے ٹِک ٹِک ابھی تھمی مجھ میں

اِسی طرح ہوئی رخشندہ ذات کی تکمیل
تُو دیکھتا ہے ہر اک بار کچھ کمی مجھ میں

O

آسماں سے سوال آخری ہے
کیا محبّت کا سال آخری ہے

بہہ چکے آنکھ سے سبھی آنسو
آنکھ میں اک ملال آخری ہے

سب تھکے ، ہارے جا چکے ہیں گھر
راہ میں اک نڈھال آخری ہے

ایک ، اک تارہ ہو گیا ہم رقص
گھنگھروؤں کی دھمال آخری ہے

آئینے ! اِس طرح نہ دیکھ مجھے
گویا مجھ میں جمال آخری ہے

موجِ دل کے بہاؤ سے بچ کر
اُٹھنے والا خیال آخری ہے

خواہشوں کی طویل فہرستیں
آرزوئے وصال آخری ہے

اے مری زیست کے سہولت کار!
دھیرے سے دم نکال ، آخری ہے

پھانس اٹکی ہوئی ہے سینے میں
شیشۂ دل میں بال آخری ہے

دشمنِ جاں بھی ہے ، وہ رخشندہؔ!
جس کے شانے کی ڈھال آخری ہے

O

دلِ بے رنگ کا کھِلنا ضروری ہو گیا تھا
بچھڑنے کے لیے ملنا ضروری ہو گیا تھا

وہیں پر رُک کے رہ جاتا خدا حافظ کا لمحہ
تمہارے ہاتھ کا ہلنا ضروری ہو گیا تھا

وگرنہ زہر پورے تن ، بدن میں پھیل جاتا
سو ایسے زخم کا چھلنا ضروری ہو گیا تھا

تمھیں ہر دم پکارے جا رہے تھے بے سبب ہم
لبوں کا اس لئے سِلنا ضروری ہو گیا تھا

O

ملی نہیں ہوں ترے بعد ملنے والوں کو
پڑھے بغیر کِیا ردّی سب رسالوں کو

مبادا جِن کوئی عاشق مزاج مل جائے
سمیٹ لینا سرِ شام اپنے بالوں کو

کبھی دکھائی دیا فرشِ رقص پر ہم رقص
کیا ہے زیبِ گُلو سُر کو اور تالوں کو

کسی مقام پہ کچھ فلسفی الگ بیٹھیں
خیال آتا نہیں کیا یہ ہم خیالوں کو

چلو لگائیں نشاں کاٹے کا کلنڈر پر
حیات سے کریں منہا مہینے سالوں کو

O

ہر گھڑی موت کا ڈر نہیں چاہیے
زندگی جا یہ ٹرٹر نہیں چاہیے

میں محبت کو دُنیا میں پھیلاؤں گی
مجھ کو بتلا! تجھے گر نہیں چاہیے

اک تہی رکھا رہتا ہے ڈبا کوئی
مجھ کو شانوں پہ یہ سر نہیں چاہیے

رقصِ بسمل کو محدود کیسے کروں
تنگ و تاریک سا گھر نہیں چاہیے

□

ملنے آئیں گے ہم اُن سے اُڑتے ہوئے
ان پرندوں کو ہی پَر نہیں چاہیے

عشق میں جتنی جائز ہیں سفاکیاں
ظلم کچھ اس سے بڑھ کر نہیں چاہیے

رات ہو ، دن ہو ، یا شب کا کوئی پہر
شور ، ہنگامہ و شر نہیں چاہیے

دیکھ مجھ کو ، کبھی تو نے دیکھا مجھے
وہ جسے زیور و زر نہیں چاہیے

O

ذاتی ہے دردِ عشق ، سو چپ ، چاپ لیجیے
اس جاں پہ تہمتیں بھی سبھی آپ لیجیے

جو ہو گیا وہ ہونا تھا آخر کو ایک روز
میں نے کہا تھا گوشہ مرا چھاپ لیجیے

ان کے لیے تو سانسیں ہماری اکھڑ گئیں
اور وہ بضد رہے کہ فقط بھاپ لیجیے

ان آبلوں کا کیسے ہے ممکن کوئی شمار
صحرا کے طول و عرض فقط ناپ لیجیے

ہم رقص ، گھنگھروؤں کی ضرورت نہیں پڑی
دھڑکن کے ساتھ ، ساتھ ہی ہر تھاپ لیجیے

ہر شخص جاں بچانے کی اِس فکر میں گیا
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے ، ندی ٹاپ لیجیے

کافی کے کپ نہیں ہیں اُدھر سبز گھاس پر
ہے سردیوں کی دھوپ وہی تاپ لیجیے

O

ثابت کرے یہ وقت کہ جذبات کچھ نہ تھے
گزرے حسین جتنے بھی لمحات کچھ نہ تھے

خنجر تھا میرے ہاتھ میں آلات کچھ نہ تھے
مجھ بے ضرر سے آپ کو خطرات کچھ نہ تھے

مانگا ہی کیا تھا ہم نے فقط ربط کے سوا
اے شخص! ہم کو تجھ سے مفادات کچھ نہ تھے

اک اور بات لب پہ سجا کر وہ آ گئے
یعنی وہ پہلے والے بیانات کچھ نہ تھے!

□

کُھلتا نہیں کسی پہ بھی اک راز موت کا
اس زندگی میں یوں بھی طلسمات کچھ نہ تھے

کب جیت کے ارادے سے آئے تھے آج ہم
نقصان اس لیے بھی تہہِ مات کچھ نہ تھے

مجھ کو تو ایک شخص کی خواہش تھی، اے خدا!
میری نظر کے سامنے، دن ،رات کچھ نہ تھے

O

دن کہ ہو رات رہنے والا نہیں
تو مرے ساتھ رہنے والا نہیں

میرے مہماں کو کتنی جلدی ہے
ایک بھی رات رہنے والا نہیں

عشق بھی آٹھواں عجوبہ ہے
اب عدد سات رہنے والا نہیں

اب کے طوفانِ باد و باراں میں
ایک بھی پات رہنے والا نہیں

میں نے موجوں کو دیکھ کر جانا
ہاتھ میں ہات رہنے والا نہیں

کاش کہہ پائیں ہم کہ پاک وطن
زیرِ آفات رہنے والا نہیں

رُخ پہ نقش و نگار سا ہے ملال
بات ، بے بات رہنے والا نہیں

O

حال ایسا اس سے بعدِ ملاقات جو ہُوا
نیندوں میں چلنا موجبِ عادات جو ہُوا

آغاز ہو گئی تھیں سبھی غلطیاں مری
بھولے سے سر ہلا ، وہی اثبات جو ہُوا

تشکیل دے دیا گیا عُشّاق کا گروہ
بدلہ لیا پتنگے نے اس رات جو ہُوا

اس کا اثر پھر آتے برس تک نہیں گیا
اتنا فساد اس گھڑی بے بات جو ہُوا

□

ہر وقت مانگتے ہیں ازل سے حقیر ہم
مالک سے ، ربِ ارض وسماوات جو ہُوا

لوگوں کو آج تک یہ چل نہیں سکا پتا
مجھ میں ہے کون ، محوِ خرافات جو ہُوا

اس کو بھی پورا ، پورا رہا تتلیوں پہ حق
پھولوں کے ساتھ چپکا ہُوا پات جو ہُوا

دریاؤں کا ظہور بھی ہوتا ہے آنکھ میں
اک قطرہ تھا ، وہ پانی کا برسات جو ہُوا

رخشندہؔ میں نے گالی کبھی کم ہی دی ، مگر
عورت کو لوٹتا ہے ، وہ بدذات جو ہُوا

○

اِختیار خاموشی
میرے یار! خاموشی

پہلے بول کر دیکھا
اب کے بار خاموشی

جیت اک تماشا ہے
اور ہار ، خاموشی

ڈھونڈتی ہے گھر اپنا
دور ، پار خاموشی

قرعے میں نکلتی ہے
بار ، بار خاموشی

وصل ، شور ہستی کا
انتظار ، خاموشی

دل سدا پُکارے ہے
پیار ، پیار خاموشی

گڑ گئی ہے سینے کے
آر ، پار خاموشی

حُسن کا نمونہ تھی
اشک بار خاموشی

لے گئی خموشی سے
سُوئے دار خاموشی

دل پہ ڈال سکتی ہے
کتنا بار خاموشی

گفتگو مری محفل
گُل ، بہار خاموشی

عمر بھر ، تُو رخشندہَ!
اب سہار خاموشی

O

وہ تو زندہ ہے کہا کس نے کہ وہ مر گئی ہے
اُس کا اپنا تھا وہی اپنے ہی وہ گھر گئی ہے

کسی برسات کی حاجت ہی نہیں باقی مجھے
میری آنکھوں کے ندی نالوں کو وہ بھر گئی ہے

میں تو دو اُٹھے ہوئے ہاتھوں سے ہی مانگتی تھی
آتے وقتوں کے لیے بھی وہ دعا کر گئی ہے

اُس کے جانے سے خفی کتنے مظاہر بھی کھلے
جتنے پوشیدہ تھے افشا وہ نظر کر گئی ہے

اس لیے آتی نہیں قبر کو چھُونے ترے پاس
تھی جو جنت کی سواری وہ سفر کر گئی ہے

موت کا جِن جو بہت پاس سے گزرا اُس روز
ماں تری بیٹی پریشان ہے وہ ڈر گئی ہے

O

اپنے ہاتھوں سکوں سے خالی کیا
خانۂ دل جنوں سے خالی کیا

ماننا اپنے رب کو چھوڑتے ہی
عشق کا در فسوں سے خالی کیا

ہے نمو میں ابھی شجر لیکن
یہ بدن اپنا خوں سے خالی کیا

ان منڈیروں پہ گھر کی رکھے چراغ
گھر مگر اندروں سے خالی کیا

ہنستے بستے ہوئے گھروندے کو
چار جانب ستوں سے خالی کیا

○

ہم اُس بدلی کالی سے کتنا ڈرتے ہیں
کمرے کی جالی سے کتنا ڈرتے ہیں

پھولوں کا یہ جھُنڈ بھی کر دے گا مسحور
ہری بھری ڈالی سے کتنا ڈرتے ہیں

چوڑیوں کی مانند نہیں چھنکی پھر بھی
گوش کی اس بالی سے کتنا ڈرتے ہیں

بٹیا کو ہم سب نے مسئلہ جان لیا
ہاتھوں کی پالی سے کتنا ڈرتے ہیں

□

خوفزدہ دربان ہے دن کے ڈھلتے ہی
شہر کی رکھوالی سے کتنا ڈرتے ہیں

چھ فٹ کے انساں بھی خوفزدہ دیکھے
وہ بھی گھر والی سے کتنا ڈرتے ہیں

سڑک پہ ہوتی مار پیٹ سے رخشندہؔ
جھگڑے اور گالی سے کتنا ڈرتے ہیں

O

تمھارے گھر گئی تو
زیادہ ڈر گئی تو

اسے مُنہ مت دکھانا
اگر میں مر گئی تو

وہی تنہائی ہو گی
کبھی جو گھر گئی تو

نہ ہو گا پار دریا
اگر میں کر گئی تو

خطوں کی سطر تک بھی
یہ چشمِ تر گئی تو

نظر ہوں ایک خالی
اگر وہ بھر گئی تو

مرا پیغام لے کر
اُدھر صرصر گئی تو

O

اعتراف اور کتنی بار کریں
ہم ہیں روزے سے، اعتبار کریں

زخم کی ستر پوشی لازم ہے
اتنی روشن نہ رہ گزار کریں

قہقہے پھیکے، اشک ہیں نمکین
آپ جو چاہیں اختیار کریں

اتنی جلدی ہے کیا معافی کی
میرے مرنے کا انتظار کریں

کس نشانے پہ ہے ہدف ان کا
تیر کو دل کے آر ، پار کریں

وہ تو ہر اک کو جان کہتے ہیں
مجھ پہ وہ جان مت نثار کریں

خود میں کچھ کم ہوا ہے، رخشندہؔ!
میرے عُضوِ بدن شمار کریں

O

خود سے ہارے ہوئے قدموں کی دھمک پڑتی ہے
مَت بجا بانسری، سینے میں کسک پڑتی ہے

جاننا چاہتے ہیں لوگ مرے حُسن کا راز
ماہ و خورشید کی چہرے پہ چمک پڑتی ہے

میں نے مُدّت سے نہیں پہنا کوئی بھی زیور
تُو اگر تھامے کلائی میں کھنک پڑتی ہے

جانتی ہے مری پائل تری باہوں کا مزاج
رقص میں آنے سے پہلے ہی چھنک پڑتی ہے

□

زور سے دل کا دھڑک اُٹھنا خلافِ معمول
روبرو اُس کے زباں میں بھی اٹک پڑتی ہے

کچھ پرانے پڑے اشکوں کا یہی مسئلہ ہے
آنکھ جھرنوں کی طرح یونہی چھلک پڑتی ہے

حبس میں جس بھی طرف تازہ ہوا چلنے لگے
خلقتِ شہر اُسی سمت لپک پڑتی ہے

جب بھی مقصود مجھے جیت ہوئی، رخشندہؔ!
کم اُسی وقت محبت کی کمک پڑتی ہے

O

لگانا پڑتا نہیں تل کوئی بھی گال کے ساتھ
خدا نے خلق کیا ہے تجھے جمال کے ساتھ

زمین جھوم اُٹھے اور ستارے رقص کریں
قدم اُٹھا کے تُو چلتی ہے سُر کے تال کے ساتھ

ترے خرام سے ہر مُورنی نے سیکھا ہے
کہ کیسے گھنگھرو چھنکتے رہیں گے چال کے ساتھ

تو میری آنکھ کا سب سے حسیں نظّارہ ہے
دکھائی دیتی ہے مجھ کو گلوں کے جال کے ساتھ

دلوں کی راجکماری تُو ہے فرشتہ صفت
غرض تجھے ہے جواہر سے اور نہ مال کے ساتھ

میں تجھ سے آنکھ ہٹاؤں تو پھر پلٹتی ہے
میں دیکھتی ہوں تجھے خود بھی احتمال کے ساتھ

تو اپنے دل کی کہانی عیاں نہیں کرتی
سجا کے رکھتی ہے کانٹوں کو اپنی ڈال کے ساتھ

نہ جانے کون سی مٹّی سے تُو بنی ہوئی ہے
حیات اپنی بسر کرتی ہے کمال کے ساتھ

مہکتے پھولوں سی کومل تُو حد سے نازک ہے
ہوا! تو اس کی طرف دیکھنا خیال کے ساتھ

بُری نظر سے بچے اُس سے ہوں بلائیں دُور
نشاط اور فزوں تر ہو ماہ و سال کے ساتھ

اب ایسے گوہرِ نایاب ہو چکے ناپید
ذرا سنبھال کے، اے وقت! دیکھ بھال کے ساتھ

محبتوں کا سماں چاہتوں کا ابرِ رواں
یہ سب عنایتیں ہوتی ہیں خال، خال کے ساتھ

O

رکھتا ہے دل میں کس لیے یوں اک عناد تُو !
بانٹے گا میرے ساتھ کوئی جائیداد تُو؟

ہے باعثِ وفور بھی، وجہِ فساد بھی
یوں شدتوں سے آتا ہے کیوں ہم کو یاد تُو

انساں غرض کا مارا ہوا ہے ازل سے دوست
کچھ سوچ کر جتانا ذرا اعتماد تُو

میں پھر سے کہہ رہی ہوں کہ تجھ کو قسم لگے
اک روز کاش سن سکے، خاموش ناد تُو

تجھ کو دکھائی دیتا نہیں آئینہ کبھی
میں جانِ جاں کہوں تو ہے میری مُراد تُو

میرے مشاہدے میں ہے انساں کی نفسیات
دیکھے گا رات ، دن میں بس اپنا مفاد تُو

یہ کم ہے ، میں نے خوب نبھایا حیات کو
جتنی بھی حوصلے کی بنے دینا داد تُو

ملنے نہ آؤں تجھ سے کبھی رنجشوں کے بعد
ایسا کوئی بھی حکم نہ کر دینا صاد تُو

نازک سا عشق اتنا اہم کب سے ہو گیا
کِن پہلوؤں پہ کرنے لگا اجتہاد تُو

رخشندہؔ تیرے ہاتھ میں ہیں کتنی اُنگلیاں
ہر ظلم کے خلاف کرے گی جہاد تُو

O

درد و غم زیادہ ہیں، نسبتاً خوشی کم ہے
زندگی کے لمحوں میں ایک زندگی کم ہے

بار، بار اس دل کا دار پر چڑھے رہنا
غور سے ذرا دیکھیں، کیا یہ خودکشی کم ہے

اک تضاد دیکھا ہے عُمر بھر یہی ہم نے
خوش مزاج کہلائے، ہونٹ پر ہنسی کم ہے

چند ایک سے ہٹ کر، چارسُو زمانے کی
پیچ دار گلیوں میں، حُسن و روشنی کم ہے

مِل تو جائے، رخشندہؔ! پکّی نوکری تجھ کو
جانِ مَن ترے اندر خوئے بندگی کم ہے

O

ضد باندھی ہے دل نے، پر پابندی ہے
جان من! تجھے ملنے پر پابندی ہے

کچھ اشعار کی پنکھڑیاں بھیجوں تجھ کو
پھولوں کے لب کِھلنے پر پابندی ہے

دیکھنے کو تجھے یک دم آنکھیں تڑپ اُٹھیں
جب سے سنا تجھے ملنے پر پابندی ہے

ہم اشجار نہیں ہیں لیکن کچھ دن سے
اپنی جگہوں سے ہلنے پر پابندی ہے

جب تک دعا نہ پہنچے نیلی چھتری تک
کریں دعا، لب سلنے پر پابندی ہے

اک ناسُور میں ڈھل جانا جس کا انجام
ایسے زخم کے چھلنے پر پابندی ہے

○

مُشکل روڑا بن جاتا ہے
ملن بچھوڑا بن جاتا ہے

آنسو ، آنسو مِل کے سمندر
یونہی تھوڑا بن جاتا ہے

اتنا تیز دھڑکتا یہ دل
پاگل گھوڑا بن جاتا ہے

چار اطراف ، نکیلے پتھر
لفظ ، ہتھوڑا بن جاتا ہے

انجانے دو انسانوں کا
فلک پہ جوڑا بن جاتا ہے

کینسر بعد میں، دکھ کا پہلے
دِل میں پھوڑا بن جاتا ہے

موم کے اک پتلے سا انساں
جِدھر کو موڑا، بن جاتا ہے

رخشندہؔ! محبوب تمھارا
ایک بھگوڑا بن جاتا ہے

O

اور اِک قید ہے رہائی پر
ختم قِصہ ہوا جُدائی پر

آج کی رات سو کے دیکھیں گے
ہم سمندر کی چارپائی پر

دیکھ لیں ، آپ کوششیں کر لیں
ہم مریں گے تو اپنی آئی پر

پورے کنبہ کی پرورش ہو گی
ایک اس شخص کی کمائی پر

بچھڑے لوگوں کو پھر سے ملنا ہے
کچھ کتابوں کی رونمائی پر

روشنی کی طلب میں اپنا ہاتھ
رکھ دیا تھا دیا سلائی پر

توڑ کر پھول دان میں رکھا
کیا مِلا گُل کو آشنائی پر

□

○

اسپِ تازہ کی رفتار سے بھاگ اُٹھا
دل میں سویا عشق دوبارہ جاگ اُٹھا

آنکھیں آخر کس دن پھر کام آئیں گی
پانی اِدھر سے مل جائے گا آگ اُٹھا

دروازے پر قفل کہاں لگ سکتا ہے
بیٹھے ہیں کچھ دیواروں پر کاگ ، اُٹھا

رستے صرف دعاؤں سے نہیں کھُل سکتے
پہلے سوئے پڑے ہوئے یہ بھاگ اُٹھا

سیپ کو حاصل کر لینا آسان ہے کیا
دریا سے اک دن پہلے کچھ جھاگ اُٹھا

○

پلک سے توڑ کر اک تار ڈالا
کسو نے خط میں حالِ زار ڈالا

نہیں تھا مسئلہ صحت کا کوئی
ہمیں اک اور دکھ نے مار ڈالا

شجر پر جھولتے لاشے نے شاید
محبّت کا گلے میں ہار ڈالا

نیا اک رخ دیا ہے زندگی نے
کہانی میں نیا کردار ڈالا

بڑے تم عمر میں لگنے لگے ہو
نیا کیا خُود پہ ایسا بار ڈالا

مکمّل کب ہوئی تصویر میری
سو رنگِ غیرت و پندار ڈالا

O

جیون کا ادراک نہیں
چھانی خاک میں خاک نہیں

دیپ جلانا چھوڑ دیا
آنکھ مری نمناک نہیں

میں نے جس سے عشق کیا
وہ اتنا بیباک نہیں

جتنا ہم سے دور ہو تم
اتنے دُور افلاک نہیں

بول رہی ہوں گھنٹوں سے
تم سمجھے کیوں خاک نہیں

صوفی رنگ جھلکتا ہو
پہنی وہ پوشاک نہیں

O

دو دن کی اُداسی کا سفر سالوں کے جیسا
برسات میں بھر جاتے ندی ، نالوں کے جیسا

کچھ آئے پکڑ میں تو شمار اس کا بھی کر لیں
گنتی میں کہاں آئے گا دُکھ بالوں کے جیسا

کوئی بھی مجھے دیکھ کے پہچان نہ پائے
مجھ ذات میں ہے کون یہ بدحالوں کے جیسا

جو برسوں تلک کھلنے سے معذور رہے ہوں
خاموشی کا احساس ہے ان تالوں کے جیسا

اس ربط میں احساس دکھائی نہیں دے گا
دیوار کے کونوں پہ لگے جالوں کے جیسا

O

روزانہ اُس راہ پہ جانا پڑتا ہے
ایک علاقہ اُدھر پرانا پڑتا ہے

ہمدردی کی لَو اِک آنکھ میں تھی، لیکن
آگے اپنا ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے

دنیا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے
کہا! کسی نے واپس جانا پڑتا ہے

ساتھ کی کُرسی پر بیٹھے، اے پیارے شخص!
تیرے، میرے بیچ زمانہ پڑتا ہے

اس لمحے آتی ہے میری جان میں جان
چڑیا کی جب چونچ میں دانہ پڑتا ہے

کوئی علاج تلاش کرو اس حاسد کا
رستے سے پتھر کو ہٹانا پڑتا ہے

آپ کہاں دیکھیں گے محفل کے دوران
میز سے ایک گلاس گرانا پڑتا ہے

سُخن وروں کی مجبوری ہے، رخشندہؔ
ان کو اک محبوب دکھانا پڑتا ہے

O

چاند نکلا ہوا ہو رات کے وقت
پھول کھلتے ہیں تم سے بات کے وقت

دل کی رفتار گھٹتی بڑھتی ہے
جیت جانے پہ اور مات کے وقت

چار جانب بکھیرے شیریں سخن
شہد سے حرف التفات کے وقت

شب کے پچھلے پہر ہی ہوتے ہیں
سوچنے کے، قلم، دوات کے وقت

اس پہ حیرت کی رمز کوئی نہیں
خود غرض ہونا سب کا ذات کے وقت

O

تذکرہ کرتے بھلا کیسے کسی غمگین کا
ذائقہ جاتا رہا میٹھے کا اور نمکین کا

مسئلہ نازک ہے اس پر قتل ہو جاتے ہیں لوگ
گفتگو میں ذکر آنے ہی نہ پائے دین کا

اگلے درجے تک پہنچنا اس قدر آساں نہیں
صفحہ، صفحہ عشق میں پڑھنا پڑے آئین کا

دور تک دیکھی، سنی جائے گی پھر آہ و بکا
وقت جب نزدیک آتا جائے گا تدفین کا

ایک وہ اور ایک میں، رخشندہؔ اپنے درمیاں
کوئی لانا چاہتا ہے لفظ شاید تین کا

O

آنسوؤں کا کٹاؤ ، ناممکن
پار لگ جائے ناؤ ، ناممکن

جو سجاوٹ کے کام آتا ہو
مندمل ایسا گھاؤ ، ناممکن

دستبردار ہو چکے حق سے
ازسرِ نو چناؤ ، ناممکن

زندگی پھر سے مل نہیں سکتی
تم کبھی لوٹ آؤ ، ناممکن

ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوں
پہلے ایمان لاؤ ، ناممکن

ڈوب کر اُبھریں رُوئے سطحِ آب
کیسے ممکن ہے ، جاؤ ، ناممکن

□

O

قلم کی تلوار توڑ دوں کیا
میں لکھنا پڑھنا ہی چھوڑ دوں کیا

ہزار چہروں سا ایک چہرہ
یہ ٹکڑے اس بار جوڑ دوں کیا

سمجھ میں آتا نہیں ہے اس کی
پکڑ کے کاندھے جھنجھوڑ دوں کیا

ہوا کسے دے رہا ہے پنکھا
رُخ اپنی جانب ہی موڑ دوں کیا

بہت غلط فیصلے لیے ہیں
خود اپنی قسمت بھی پھوڑ دوں کیا

O

بھلے گزشتہ کتابوں کا انتخاب آئے
دعا کرو کہ ہماری نئی کتاب آئے

ہماری نیندوں کو تعبیر سے بھی ہو گی غرض
ابھی تو مسئلہ یہ ہے کہ کوئی خواب آئے

جزا سزا پہ ہیں موقوف اپنے سب اعمال
کبھی گناہ کہیں درمیاں ثواب آئے

نہ اک سوال کیا آج تک تری بابت
کہا نہ کچھ بھی خدا سے مگر جواب آئے

نظر شناس نہیں ہوتا یوں بھی ہر اک شخص
نگاہِ یار میں بھی سرخ کب گلاب آئے

تمام کاوشیں کرنے کے بعد بھی اکثر
جو آئے ہاتھ میں اپنے وہی خراب آئے

O

پٹ کھولے آنکھوں نے اور دہائی دی
آنکھوں کی ٹپ ٹپ کیا تمہیں سنائی دی

دل تو ہمیشہ یوں بھی دھڑکتا رہتا تھا
عالم شخص کی صحبت نے دانائی دی

اصل ہماری ذات کا رخ کب جان سکا
فون پہ کھیلتی ہنستی ہوئی دکھائی دی

ورنہ دل میں لاشیں تیرنے لگ جائیں
شکر خدا نے ، دریا سی گہرائی دی

رخشندہَ نزدیک کی عینک پہنی ہے
نادانوں کو رب نے کم بینائی دی

O

نوکِ خار پہ جھول گئی
میں بھی تجھ کو بُھول گئی

دھڑکنے والا دل جس میں تھا
غزل وہی مقبول گئی

خوار ہوئے تھے سب اوّل
پیچھے پیچھے دھول گئی

بدن کی ڈالی کیا ٹوٹی
لکڑی شاید پھول گئی

چائے پی کر شعر کہے
شب کتنی مشغول گئی

باولی کا کچھ پتا کریں
کِس جانب مجہول گئی

ہاتھ میں کچھ بھی آیا نہیں
رقم بہت معقول گئی

O

وہ کہاں دلنشیں گیا ہو گا
آئینے تک حسیں گیا ہو گا

کھول کر دیکھتی ہُوں اپنا دل
وہ کہیں بھی نہیں گیا ہو گا

چھُو کے نکلے گا اپنی ماں کے قدم
پھر کہیں کا کہیں گیا ہو گا

اور جانا کہاں ہے انساں نے
بس وہ زیرِ زمیں گیا ہو گا

دفن، رخشندہؔ! خواہشیں ہیں جہاں
آسرا پھر وہیں گیا ہو گا

O

یہ بھی کیا سُکھ سے ایک دن نہ رہیں
زندگانی سے مطمئن نہ رہیں

اس زمیں پر بشر کا حوصلہ ہے
ایسے حالات میں تو جن نہ رہیں

باوجود اس کے رہنا پڑ رہا ہے
ورنہ اک پل بھی تیرے بِن نہ رہیں

رہنا ہے بوڑھی ماں کے پہلو میں
جن کو آتی ہے اس سے گھِن نہ رہیں

آتی ، جاتی رہے بہار ، خزاں
وقت گزرے تو سال و سِن نہ رہیں

O

گرے ہیں پتے، کہ مور پر ہے
خزاں بھی اب تو حسین تر ہے

گماں گزرتا ہے بادلوں کا
فلک پہ اک آسمانی گھر ہے

خدا بچا لے تو اب بچا لے
نشانہ دشمن کا سُوئے سر ہے

بکھر چکی ہے یہاں، وہاں پر
یہ قوم پوری ہی دربدر ہے

میں خود کو سب سے جُدا سمجھ لوں
مگر مری آنکھ بھی تو تر ہے

O

تجھ تک آنے کے لیے سوئے سفر لگ گئی ہے
چشم اس راہ پہ بے خوف و خطر لگ گئی ہے

کتنے پروانے ہیں جاں دینے کو تیار کھڑے
روشنی ان کی طرف آ کے، اُدھر لگ گئی ہے

میں کوئی بات بھی سوچے بنا کم بولتی ہوں
کی کسی اور نے، ناحق مرے سر لگ گئی ہے

اس طرح کون بچھڑتا ہے، کوئی ہوگا سبب
کیا ہمیں دیکھنے والوں کی نظر لگ گئی ہے

چارسُو رہتا تھا ہنگام گلی کُوچوں میں
آگ اس بار مگر اپنے ہی گھر لگ گئی ہے

ہر برس آتے نہیں لوٹ کے طائر اکثر
اب تو اشجار کو بھی ان کی خبر لگ گئی ہے

O

ماں کی قربت جو پاس کی ہوئی ہے
خوشبو اپنا لباس کی ہوئی ہے

ایسا لگتا ہے ماں جی کہتے ہوئے
لَب سے چَسپاں مٹھاس کی ہوئی ہے

میری ماں کی دُعا اثر انگیز
رب نے رحمت جو خاص کی ہوئی ہے

دل دُکھانا نہیں کبھی ماں کا
دل سے یہ التماس کی ہوئی ہے

کم جسے ملنے جاتے ہیں ، اس نے
زندگانی اداس کی ہوئی ہے

O

کورے لٹھے سا اَن سِلا چہرہ
کتنے دُکھ میں ہے مبتلا چہرہ

اپنی البم کو کھول کر چیخوں
اُف ، خدایا! کہاں گیا چہرہ

اک نیا دل کہیں سے لے آئیں
بن ہی سکتا ہے اک نیا چہرہ

چشم و ابرو وہی لب و رخسار
مجھ سے کچھ مختلف نہ تھا چہرہ

اپنا گھونگھٹ اٹھا حیات کبھی
اپنا اک بار تو دکھا چہرہ

O

اور کچھ بھی کہاں بچا ہُوا ہے
دل تھا، سو میری جاں بچا ہُوا ہے

دیکھ لی رات بھر زمینِ حیات
اب فقط آسماں بچا ہُوا ہے

شکر ہے پھٹ نہیں گیا غم سے
دل مرا رازداں بچا ہُوا ہے

ہجر میں راکھ ہو نہیں پایا
گہرے دُکھ کا نشاں بچا ہُوا ہے

دونوں آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑی
بارشوں کا سماں بچا ہُوا ہے

یاد فرما رہے ہیں پھر ہم کو
کیا ستم مہرباں بچا ہُوا ہے

O

گر کسی اور کے دل کا بھی کبھی خوں ایسا
تُو مرے ساتھ ہی کرتا ہے بھلا کیوں ایسا

حسن آویزاں رہے چہرۂ بارش پہ بھی
عشق میں کم ہی کوئی ہوتا ہے مجنوں ایسا

اس کے جیسا نہ کہیں ایک بھی پایا جائے
اپنے محبوب کا معیار ہی کچھ دوں ایسا

جب بھی دریا کے کنارے پہ کوئی بیٹھا ہو
ایسے لگتا ہے، کہ ہے دور وہ کوسوں ایسا

مجھ سے ہوتی ہی نہیں تلخ کلامی اے دوست
کاش کہ میں بھی جواب اس کو کبھی دوں ایسا

O

تُجھ کو سوچوں تو رنگِ در کُھل جائیں
جس طرح مورنی کے پر کُھل جائیں

اس کی خُوشبو سے مہکے میرا چمن
راستے اس کو دیکھ کر کُھل جائیں

نُور سے ایک ہاتھ دور ہوں میں!
جلوہ و حسن آنکھ بھر کُھل جائیں

جانے کیا کیا ہو تیرے جانے سے
کتنے وہم و گُماں میں ڈر کھل جائیں

آسماں بن گیا مرا بازُو
اور اب کتنا بے خبر کھل جائیں

مُنہ نہ موڑیں گے کافر و مومن
باغِ جنت کے جب ثمر کھل جائیں

دل سے اٹھ جائے ایک اک دربان
اور ہم پر یہ بحر و بَر کُھل جائیں

O

ہجر والوں کی ہوگی شام الگ
چاند چڑھتا ہے سوئے بام الگ

اس تعلّق کو کیا کہا جائے
ایک تجویز ہو ، کہ نام الگ

اُونچا ہے مرتبہ محبت کا
عشق رکھتا ہے احترام الگ

حُکمِ حاکم پہ ہو چکے مامُور
اور کتنے نئے غلام الگ

□

آنکھ میں صاف ، صاف نفرت تھی
طنز آلودہ اِک سلام الگ

کُچھ کتابیں کبھی نہیں بکتیں
سرِبازار ، سستے دام الگ

کس کبوتر کے ہاتھ بھیجیں گے
خود کو ، رخشندہؔ جی! پیام الگ

O

یہ حالت ہے بہت حیران کُن بھی
بدن تھا برف جیسا، ہاتھ سُن بھی

محبت کا جو اُس مالک نے رکھا
اضافی میرے اندر ایک گُن بھی

تجھے گیتوں سے اک گہرا شغف ہے
کبھی دھڑکن ہمارے دل کی سُن بھی

تماشا تھا ، عجب تھا ایک منظر
عجب تھی اک الگ سی دل کو دُھن بھی

ہر اک دم مسکراتے جانے والو
کبھی لگ جاتا ہے اندر سے گھُن بھی

میں قید ہَست پر کر لوں قناعت
کسی ریشم کو میرے گرد بُن بھی

O

زمانے کا غلط انداز کیوں ہے
یہاں ہر شخص دھوکے باز کیوں ہے

کسی نے کیا مجھے پھر سے پکارا
ترے جیسی کوئی آواز کیوں ہے

محبت کیا سپردِ خاک کر دوں
بھٹکتی روح بے پرواز کیوں ہے

نہ رکھنا آیا جب دل ہی کسی کا
تو پھر اس افسری پر ناز کیوں ہے

کئی برسوں سے پوچھا ہی نہیں یہ
کوئی تم سے بھلا ناراض کیوں ہے

خدا نے سوچ کر رکھا ہے اوجھل
یہ دل کا آئنہ اک راز کیوں ہے

O

عشق و عاشقی جیسا شوق کم رکھا جائے
کوئی ہلکا ، پھُلکا سا دل میں غم رکھا جائے

آنکھ بھی تو چاہے گی کچھ نہ کچھ بیاں کرنا
دل میں آگہی کو بھی، دم بدم رکھا جائے

تنگ جن پہ ہے دنیا اُن کو کیا دکھائی دے
سامنے بھلے اُن کے جامِ جم رکھا جائے

دیکھ بھال اچھّی کی، ماں نے چاروں بیٹوں کی
ایک چھت تلے سب کو تا بہم رکھا جائے

ہم نے کب کسی سے کچھ مانگنے کی کوشش کی
کچھ مگر زمانے میں، خواب نَم رکھا جائے

سات سُر کی بندش تک گیت نامکمل تھا
اس قدر تو سانسوں میں زیر ، بم رکھا جائے

O

تو مِرے پاس سے جب دُور چلی جاتی ہے
پوچھا ایک، اک سے کہ کِس سمت گلی جاتی ہے

زور سے ہنسنا بھی آتا ہے اسی زُمرے میں
غم چھپانے کے لیے آنکھ مَلی جاتی ہے

ایک خوشبو بھری نرمی میں بسی رہتی ہوں
میرے ہاتھوں سے نکل کر جو کلی جاتی ہے

درمیاں میں کوئی ساگر ہے، جدھر ہے پردیس
پاؤں کے تلووں تلے خاک جلی جاتی ہے

وقت کی خیر طلب کرتی ہے رخشندہؔ ، مگر
جان کے ٹکڑے ، مری عُمر ڈھلی جاتی ہے

O

مری طرف سے کسی روز مل تو آنا اسے
مجھے تو دیکھے ہوئے ہو گیا زمانہ اسے

وہ زندگی سے کبھی لطف بھی اٹھا نہ سکا
پڑا ہے مہنگا بہت رات، دن کمانا اسے

وہ بے وفائی کا مارا یقین کیسے کرے
اس آئینے کے کبھی روبرو تو لانا اسے

تمام عمر کے بعد آخرش سکھا دیا ہے
کھلنڈرے کسی بالک نے مسکرانا اسے

بلندیوں پہ ہوئی جا کے پاش، پاش آواز
زمین گھومی، مگر کب ملا ٹھکانہ اسے

O

لہو میں پیر ڈبویا خود
تیکھا خار چبھویا خود

گلی، گلی میں مت ڈھونڈے
جس نے ہم کو کھویا خود

پہلے مجھ کو مار دیا
مرنے پر، مرے رویا خود

خواب میں منظر بن نہ سکا
کچّی نیندیں سویا خود

کام غلط یہ دل نے کیا
اب کاٹے گا بویا خود

اشک، لکیریں سب غائب
چہرہ اتنا دھویا خود

O

یہ تھکن سفر سے نکال دے
کوئی چشمہ تھر سے نکال دے

کبھی مل نہ جائے وہ اختیار
کہ صفِ بَشر سے نکال دے

میں گلاب اُگلتی زمین ہوں
مجھے بحر و بر سے نکال دے

میں نے کھولے پنکھ اڑان کو
تو پکڑ کے پر سے نکال دے

میں خزاں رسیدہ دکھائی دوں
تو ہرے شجر سے نکال دے

کوئی منتظر ، کوئی ہمسفر
یہی وہم سر سے نکال دے

مرا عیب جو مرا آئنہ
وہ اِدھر ، اُدھر سے نکال دے

یہ جو زہر مل گیا اشک میں
اسے چشمِ تر سے نکال دے

کوئی اور بھا ئے اگر کہیں
تو دل و نظر سے نکال دے

ترا کیا پتا تو کسی بھی دن
مجھے اپنے گھر سے نکال دے

ترا ہو بھلا مرے ہم نفس
کوئی خیر در سے نکال دے

بڑے احترام سے نام کو
تُو بُری خبر سے نکال دے

○

نیند میں کھڑکی کھلی ، عکس بنے سوتے ہی
سلسلہ ملنے کا آغاز ہوا کھوتے ہی

میرے اندر سے کوئی جھوم کے نکلا باہر
مارچ کی مہکی ہواؤں کا گزر ہوتے ہی

حبس ایسا تھا کہ ہر سمت مکدّر تھی فضا
سانس میں آئی بحالی تو فقط روتے ہی

اس کو سب علم ہے رگ ، رگ سے مری واقف ہے
آئنہ بھیگا رہا رخ کو مرے دھوتے ہی

عشق میں پھولنے ، پھلنے کی صلاحیّت ہے
پھول اُگ آتے ہیں اک بیج فقط بوتے ہی

ان کے پرکھوں نے عدالت میں گزاری اک عمر
فیصلہ ہوتے ہوئے دیکھیں گے اب پوتے ہی

میں نے اک آہ کی صورت میں پُکارا ہے اُسے
رٹ لگاتے ہیں ترے نام کی سب توتے ہی

O

غمزہ نہ نزاکت نہ ادا، ناز نہ آیا
مجھ کو تو کبھی جیت کا انداز نہ آیا

بیٹھی رہی گو تکیے سے میں ٹیک لگا کر
اس روز مگر میرا سخن ساز نہ آیا

اس دل سے بہت سختی بھی دیکھی ہے برت کر
وہ ربطِ محبت سے کبھی باز نہ آیا

صد بار ہی دیکھا کیے ہم پردے اٹھا کر
ہاتھوں میں ہوا کے تو کوئی راز نہ آیا

افسانے کا کُچھ جلد ہی انجام ہُوا ہے
یہ وہ ہے کہانی جہاں آغاز نہ آیا

O

مہک مہکتی ہوئی ، بُو میں اور باس میں تھی
سرِخیال تری شکل بھی قیاس میں تھی

میں اُڑتی، پھرتی ہوئی شوخی کو پکڑتی رہی
ملی تھی تم سے تو شاید اسی لباس میں تھی

کِسی کے پاؤں کو تتلی کے رنگ چھونے لگے
مری ہوئی کئی دن سے جو نرم گھاس میں تھی

○

محبت اُس جہانی ہو گئی ہے
سپردِ خاک رانی ہو گئی ہے

وبا پھیلی ہے جو مشرق سے مغرب
قیامت کی نشانی ہو گئی ہے

سو اپنے مشترک آزار باعث
مشابہہ زندگانی ہو گئی ہے

یقیں آتا نہیں اس آئنہ پر

سمے کی کھینچا تانی ہو گئی ہے

سبھی شرمندہ ہیں اپنے کیے پر
نظر بھی پانی ، پانی ہو گئی ہے

عجب ہے کھلبلی ہر ایک جانب
عجب سی زندگانی ہو گئی ہے

کسی پچھلی صدی میں ڈھونڈ جا کر
کہ اب خوشبو پرانی ہو گئی ہے

ہماری آنکھ سے اک آنسو ٹپکا
سو دل کی ترجمانی ہو گئی ہے

تجھے پایا تو جانے کیوں یہ سوچا
مری پُوری کہانی ہو گئی ہے

O

گھر کی دہلیز جو آوازوں سے خالی کی ہے
شاملِ فرض تھی اک رسم، وہ پوری کی ہے

اپنے ناخن کو جدا اپنے بدن سے کر دوں
ربِّ کامل نے یہ انسان پہ سختی کی ہے

روشنی تیرا مقدر ہو، یقینِ صادق
میں نے اک چاند سے نسبت تری پکّی کی ہے

تیرے ساتھ آئی تھیں چڑیاں مرے دالانوں میں
میں نے پردیس تجھے بھیج کے غلطی کی ہے

ایسے اشکوں کو بہا دینا بھی آسان نہیں
روک کر اشک طبیعت ذرا ہلکی کی ہے

کب زمانے نے اسے آج بھی تسلیم کیا
زیست مختص، کبھی آدھی، کبھی پوری کی ہے

رخصتی ہجر ہے اک سرخ قبا ہو کہ سفید
زندگی! تو نے یہ مٹی بڑی میلی کی ہے

O

دُکھی ہوں مگر دکھ کی ماری نہیں ہوں
ابھی زندگی سے میں ہاری نہیں ہوں

کرے مجھ کو سر سبز بارش کا موسم
تو میں بس فقط اک تمہاری نہیں ہوں

بہت پیاس، اور دل کی وحشت، سے گزری
کسی جوگ میں ہوں، بھکاری نہیں ہوں

کھڑی ہوں میں لے کر پرندوں کے دانے
شجر کی عنایت سے عاری نہیں ہوں

پڑے رہ گئے خط ترے گھر کے باہر
میں قرطاس پر یادگاری نہیں ہوں

کہاں مجھ سے لکھے گئے ہیں قصیدے
وظیفہ جو لے وہ ، لکھاری نہیں ہوں

میں ہوں ابر جیسی ہوا سے سبک ہوں
کئی غم اٹھا کر بھی بھاری نہیں ہوں

ہوئی سُرخرو اپنی جاں دے کے اُس کو
اُسے جس کو میں جاں سے پیاری نہیں ہوں

O

بڑے بزرگ ہمارے، مہان کتنے تھے
وہ سایہ دار شجر مہربان کتنے تھے

سمندروں کے کنارے اُترنا بھول گئے
پرند اڑتے ہوئے بے تکان کتنے تھے

جہاں، جہاں تھے اسی خاک پر رہے آباد
جو کوچ کر چکے، وہ خاندان کتنے تھے

ہر ایک شخص کو آزادیٔ سخن ہے مگر
یقیں کرنے کے قابل بیان کتنے تھے

جہاز اس گھڑی رکھتا تھا پاؤں دھرتی پر
میں گن نہ پائی وہاں پر مکان کتنے تھے

نظر کے سامنے اک خامشی کا ڈیرہ تھا
زبان ہوتے ہوئے بے زبان کتنے تھے

نگاہ بھر ہی میسر ہوئے ہمیں ، لیکن
مری زمین! ترے آسمان کتنے تھے

گلے لگے ، نہ رہا شکوہ اور نہ کوئی گلہ
وگرنہ کہنے کو ہم بدگمان کتنے تھے

O

نگر ، نگر انتہا کے دن ہیں، وبا کے دن ہیں
ہَراس ،خوف، اِبتلا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

سناؤں کیسے زمانے بھر کو ، غموں کا قصّہ
خموشیوں کی صدا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

خُدا کی قُدرت کو جاننے کا ملا ہے موقع
درود کے اور دعا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

سو میرے ساتھی ! مری طرح مُسکرا سفر میں
کہ درد کی ابتدا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

□

بہار میں، ورنہ کھیلتے ہم ، چرند صورت
مگر یہ ظالم ہوا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

تمام ماؤں نے اپنے بچّے چُھپا لیے ہیں
ڈراونی کِس بلا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

کِسی بھی کونے میں گھر کے جی لگ نہیں رہا ہے
یہ لگ رہا ہے قضا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

گلے لگانا وفا نے شاید بھلا دیا ہے
معاف کیجے جفا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

ستم تو یہ ہے کہ آج موسم بہت حسیں ہے
یہ اصل میں ہُو کے،ہا کے دن ہیں،وبا کے دن ہیں

زبان جل جائے ، میں کہوں میرے گھر نہ آؤ
حقیقتِ برملا کے دن ہیں ، وبا کے دن ہیں

O

جو اپنے من کو بھایا کون دے گا
سکونِ دل ، خدایا کون دے گا

سمے کی دھوپ پھیلی چار جانب
سِوا تیرے ، یہ سایہ کون دے گا

لٹا دیتے ہیں ہم ، ورنہ کوئی بھی
جو مشکل سے کمایا کون دے گا

دوبارہ راستہ دے گا وہ جس نے
مجھے رہ سے ہٹایا ، کون دے گا

کہاں تک ڈھونڈیے مالِ غنیمت
فلک نے جو لُٹایا کون دے گا

اگر یہ نوکری چھٹ جائے میری
مرے گھر کا کرایہ کون دے گا

□

O

ہزار صدیوں پہ پھیلتے جاتے ہجر کے سال و سن مُبارک
گلے لگے کون اس کے جا کر کہے محبت کا دِن مُبارک

شجر کے پتّوں سے کرنا اندازہ بے حسابی کا میرے دل کی
شمار کرنا یہ موجِ قلزم ہر اک ستارے کو ، گِن ! مبارک

جو ایک بالشت بھر کی دُوری پہ چلتے، چلتے ٹھہر گیا ہے
قدم، قدم خیر راستوں کی قدم، قدم اُس کے بِن مبارک

حیات کی وادیوں میں کوئی یہ کس طرف سے اُتر چکا ہے
جدائیوں کی صدا لگاتا یہ دیوہیکل سا جِن مبارک

سجا لیے ہیں بہت قرینے سے ہجر کے گُل بھی اپنے گھر میں
سنہری زلفوں کے پیچ، رخشندہ! آپ کو کالی پِن مبارک

○

قبیلہ داری ہے فیض اور فراز والوں سے
مگر جو کچّی ہے نسبت، ہے آز والوں سے

سکھایا سجدے کا مفہوم سر کٹاتے ہوئے
حسینؑ خود تھے مخاطب نماز والوں سے

گزاری پھولوں میں یا خار دار جھاڑی پر
یہ راز پوچھیے عمرِ دراز والوں سے

نہ جانے بھیک یہ کیوں مانگتے ہیں شاعر لوگ
حسین چہروں سے، معصوم، ناز والوں سے

□

ہمارے دل میں بسی تھی جہاں کی تہہ داری
رہے گی دوستی راز و نیاز والوں سے

اُبھرتا رہتا ہے ہر دم کوئی دھڑکتا سُر
دلوں کا کام نکلتا ہے ساز والوں سے

ہزاروں گیت سُنے ہم نے یوں تو، رخشندہؔ!
مگر جو سوز ملا ہے گداز والوں سے

O

چشمِ طلب کو درشن ملنے والے ہیں
پھر من چاہے مسکن ملنے والے ہیں

فلک کی رنگت بدلی تو احساس ہوا
حبس زدوں کو ساون ملنے والے ہیں

ہم گلیوں میں پھر سے کھیلنے جا نکلے
جیسے پھر سے بچپن ملنے والے ہیں

خوشی مناتے اچھے لگتے ہیں وہ لوگ
وہی کہ جن کو ساجن ملنے والے ہیں

پیڑوں کی خوشبو سے عِلم ہوا ہو گا
بے سمتوں کو آنگن ملنے والے ہیں

وقت سے پہلے پتا نہیں چل سکتا ہے
رخشندہؔ! ہمیں راون ملنے والے ہیں

O

گزارے جنگل و میداں ، چھُوا پہاڑی کو
ہمارا ساتھ بھلا لگ رہا تھا ، گاڑی کو

اے میرے زخمی پرندے! تُو میرے سینے میں
ہرا ، بھرا کیسے رکھتا ہے خشک جھاڑی کو

گماں نہیں تھا کہ اک روز اک ادھورا عشق
مکمل اس طرح کر دے گا مجھ اناڑی کو

ہوا کو قابو میں رکھنا نہیں تھا بس میں مرے
سنبھالنے میں لگی تھی میں اپنی ساڑی کو

بہاؤ رُکتا نہیں آنسوؤں کا ، روکے بغیر
کسی نے چھیڑا نہیں تھا لکیر آڑی کو

پرانی صدیوں کی یادیں سنبھالے پھرتے ہیں
کوئی بھی دیتا نہیں ہے کسی کباڑی کو

O

سب مسئلے انا کے
ملنا کبھی بھلا کے

کیا فائدہ دوبارہ
پھر سلسلے بڑھا کے

طاقت کو جمع رکھا
سبھی غم تھے انتہا کے

نیندوں میں وہ مخل ہیں
کچھ رَت جگے بلا کے

□

جھلسی ہوئی ہتھیلی
لوٹی ہوں خط جلا کے

پَر اُن کبوتروں کے
رکھیں ہیں کیوں سجا کے

چہرے کو میرا مہ رُو
چھپ جائے گا دِکھا کے

O

ہاتھ کا ایک ہات ہو تم بھی
زندگی ہے ، تو ساتھ ہو تم بھی

مُسکراہٹ لبوں پہ کھلنے لگی
شوخ سی کوئی بات ہو تم بھی

میں نے ہر رنگ بھر لیا خُود میں
باعثِ شش جہات ہو تم بھی

مجھ کو ہی وجہِ عشق جانا گیا
باعثِ التفات ہو تم بھی

موسموں کی عطا ہیں یہ اشعار
مجھ قلم کی ، دوات ہو تم بھی

اس کو کہتے ہیں لازم و ملزوم
میں اگر دن ، تو رات ہو تم بھی

O

اک نیا سا گناہ کر بیٹھے
تیری جانب نگاہ کر بیٹھے

آگئی درمیاں میں کوئی غَرَض
دوستی کو تباہ کر بیٹھے

اُس نے نظمیں کئی سُنا ڈالیں
ہم جو بھولے سے واہ کر بیٹھے

زرد پتے شجر سے ٹوٹ گرے
زیرِ لب ہم جو آہ کر بیٹھے

شعر موزوں نہ ہو سکا اک بھی
کتنے کاغذ سیاہ کر بیٹھے

ہم کسی اور کے نہیں ہوں گے
شاعری سے نباہ کر بیٹھے

O

مرے خیال میں گُم، بے حساب پیتے ہوئے
تم اچھے لگتے ہو مجھ کو شراب پیتے ہوئے

سماعتیں تھیں کہ ترسی ہوئی تھیں مُدّت سے
وہ ان کہی تھی جو کہہ دی جناب پیتے ہوئے

تمام جام الٹ! دید کا ہے دم کافی
پلک ،پلک سے ملے مشکِ ناب پیتے ہوئے

اُلٹ، پلٹ دیے صفحاتِ روز و شب اس نے
رہا نہ رات میں ،دن کا حساب ، پیتے ہوئے

□

خیال رکھ، کہ لبوں پر جمی رہے مسکان
یہ اشک! اے دلِ خانہ خراب پیتے ہوئے

کنارِ آب کھڑے رہ کے بھی ہوا سرشار
وہ جس نے عمر گزاری سراب پیتے ہوئے

جواب دیں گے محبت کا ہم محبت سے
کبھی کریں گے یہ کارِ ثواب پیتے ہوئے

ذرا سی دیر ہے ، رخشندہؔ! جشنِ آزادی
بھلائے جائیں، اصول و نصاب پیتے ہوئے

O

گریہ و ماتم آنکھوں کا
دیکھ لے ہمدم آنکھوں کا

صحرا ناپتے ، ناپتے نکلے
روز و شب ہم آنکھوں کا

دونوں عارض پی جاتے ہیں
رہا ، سہا نم آنکھوں کا

کوئی کوئی پڑھ سکتا ہے
تحریری غم آنکھوں کا

□

دیکھے بنا اُسے کیسے نکلے
جان بلب دم آنکھوں کا

طوفانوں کو کھینچ نہ لائے
یہ زیر و بم آنکھوں کا

اشکوں کا چھڑکاؤ لازم
غصہ ہو کم آنکھوں کا

گھنے سلیٹی ابر کے جیسا
برس چکا غم آنکھوں کا

رخشندہ جُھکنے مت دینا
دیکھو پرچم آنکھوں کا

O

لمحہ لمحہ محال گزرا تھا
مُشکلوں سے یہ سال گزرا تھا

میرے دل میں تو کچھ گلہ بھی نہیں
صرف شیشے سے بال گزرا تھا

تو گُزر کر گیا تو ایسا لگا
جیسے پھولوں کا تھال گزرا تھا

چوکڑی بھرتا دل کے جنگل سے
آج پھر اک غزال گزرا تھا

دوست جب بھی ملا کوئی سرِراہ
پوچھ کر میرا حال گزرا تھا

سبز وادی، مہکتی شاموں تلے
خوب ماہِ وصال گزرا تھا

O

زمیں نے جذب کیا پانی میں بہایا ہوا
کسی پہ خرچ تو کرنا ہی تھا کمایا ہوا

پروں میں چونچ دبائے پرند بیٹھے ہیں
ہوا نے توڑ دیا گھونسلہ بنایا ہوا

کُھلے پڑے در و دیوار قتل گاہوں کے
کِسی کے کھانے میں بھی زہر تھا ملایا ہوا

یہ سانس پھولتی جاتی تھی زور چلتا نہ تھا
رویہ سخت ترا میرے مُنہ کو آیا ہوا

چلو بجائیں کوئی گیت حسبِ حال ایسا
کسی کو وعدہ نہیں یاد ، اک بھلایا ہوا

اُٹھا تو فیصلہ حق میں اُسی کے ہو چکا تھا
جو اپنے ساتھ شہادت نہیں تھا لایا ہوا

○

زخم تو خود بخود مندمل ہو گئے
ہوتے ہوتے ہمیں مضمحل ہو گئے

کچھ توازن صبا نے دیا اور کچھ
موسموں کے سبب معتدل ہو گئے

اشک ، الجھن ، اداسی مرکب بنے
کیسے اجزا پہ ہم مشتمل ہو گئے

پھر سے ہم نے جنم اور اک لے لیا
اپنے بچوں میں ہی منتقل ہو گئے

روشنی سے نگاہیں بھی چندھیا گئیں
نیند میں خواب جب بھی مخل ہو گئے

روز دی ہے معافی کسی شخص کو
دل سے مجبور تھے ، نرم دل ہو گئے

روز کے روز کی مشکلیں سہہ تو لیں
وہ جو آزار کچھ مستقل ہو گئے

یہ ہمیں چارسو ہیں فلک تا زمیں
ابر و باراں ، کبھی آب و گِل ہو گئے

O

گھُپ اندھیرے بھی اچھے لگتے ہیں
چُپ سویرے بھی اچھے لگتے ہیں

غول در غول آسمانوں پر
کالے کوّے بھی اچھے لگتے ہیں

کھیلتے کُودتے برآمدوں میں
شوخ بچے بھی اچھے لگتے ہیں

آپ کے ساتھ کی کرامت ہے
پھیکے لمحے بھی اچھے لگتے ہیں

لوٹ جاتے پرند بھی سرِ شام
صبح تڑکے بھی اچھے لگتے ہیں

ریگِ ساحل پہ پا برہنہ مجھے
سنگریزے بھی اچھے لگتے ہیں

جانے کیوں کوئلے دہکتے ہوئے
سُرخ شعلے بھی اچھے لگتے ہیں

پیار میں کہتے رہتے ہو، مجھ پر
میلے کپڑے بھی اچھے لگتے ہیں

حد سے بڑھ کر تُو اچھا لگتا ہے
تیرے دھوکے بھی اچھے لگتے ہیں

خامشی کی ہیں اپنی آوازیں
خالی کمرے بھی اچھے لگتے ہیں

ہجر سے بھی مَفر نہیں ہم کو
وصل صدمے بھی اچھے لگتے ہیں

O

اک پرندہ چٹان چھوڑ گیا
آسماں پر اڑان چھوڑ گیا

بے دلی ایسی چھا گئی دل پر
اپنا ہر امتحان چھوڑ گیا

وہ تعاقب میں ایک ہرنی کے
تیر ، ترکش ، کمان چھوڑ گیا

قیمتی دوست ہائے قیمتی دوست
حال ہی میں جہان چھوڑ گیا

میں نہیں جانتی پتہ اس کا
وہ اچانک مکان چھوڑ گیا

ہم تو نقشِ قدم پہ چلتے ہیں
میرؔ اپنی زبان چھوڑ گیا

دنیا چھوڑی تو دولت و عہدہ
اپنی سب آن بان چھوڑ گیا

اعتماد اندھا کرکے بیٹھے تھے
تھا ہمیں جس پہ مان چھوڑ گیا

زندگی چھوڑ جائے گی ہم کو
تُو اگر میری جان چھوڑ گیا

جیتنے والا کس طرح میدان
جیت کے درمیان چھوڑ گیا

O

پوری نہ ہو سکے گی کہانی ترے بغیر
کیسے رہے ہنسی خوشی رانی ترے بغیر

کس موڑ پر بہار کے دن ختم ہو گئے
آئی نہ رُت پلٹ کے سہانی ترے بغیر

چل ہی نہیں سکے گا یہ قدرت کا کاروبار
ابرِ رواں کا خشک ہے پانی ترے بغیر

رکھتے ہیں کیسے باغ میں پژمردہ کوئی پھول
مشکل ہے پتّی پتّی اٹھانی ترے بغیر

کیسے نیا بنائیں گے سامانِ ہست ہم
ہر چیز لگ رہی ہے پُرانی ترے بغیر

بکھری پڑی ہیں وقت کی انجانی کُنجیاں
بھولے ہیں اپنے گھر کی نشانی ترے بغیر

کڑوے ہوئے زبان پہ نمکین ذائقے
میٹھے کے بھی بدل گئے معنی ترے بغیر

پگڈنڈیوں پہ کالے گلابوں کے جھاڑ میں
ہم نے گزار دی ہے جوانی ترے بغیر

O

خوش سلیقہ نگین عورت تھی
شہر کی اک حسین عورت تھی

پیڑ اور پودوں سے سجا ٹیرس
جس مکاں کی مکین عورت تھی

بیج چڑھتا ہے کوکھ میں پروان
گویا فصلِ زمین عورت تھی

زندگی کا پہاڑ کاٹ گئی
دیکھنے میں مہین عورت تھی

وقت نے ضائع کر دیا اس کو
وہ بلا کی ذہین عورت تھی

نام رخشندہؔ تو نہیں اس کا
وہ جو خندہ جبین عورت تھی

O

ہم ہیں کنکر زمیں میں رُل کر بھی
ہیرے اور موتیوں میں تُل کر بھی

زخم تن پر نشان چھوڑ گئے
تیز بارش میں خوب دُھل کر بھی

بارشوں نے یہ حوصلہ دیا ہے
اشک برسے ہمیشہ کُھل کر بھی

کون سنتا ہے خامشی کی زباں
اتنی تکلیف ہے تو غُل کر بھی

نور کافی ہے اپنی آنکھوں کا
ان چراغوں کو آج گُل کر بھی

ٹھوس مٹی ہے جڑ میں رخشندہؔ
کُھل نہیں پائے گی یہ کُھل کر بھی

O

جو تیرے دل میں ہے پوشیدہ بات ظاہر ہو
کچھ ایسا کر کہ ترا التفات ظاہر ہو

جگہ جگہ جسے دیکھا گیا ہے ساتھ مرے
جو میرے شانے پہ رکھا تھا ہات ظاہر ہو

محبتوں میں بس اک ماں کا پیار دیکھا ہے
جو چار دن کا نہیں ، تاحیات ظاہر ہو

ہری بھری کسی بستی میں جابسیں ہم تم
فرارِ زیست میں لطفِ نجات ظاہر ہو

ٹپک ٹپک کے گرا آنکھ سے وہ اِک اِک اشک
جو پھول پھول کِھلے پات پات ظاہر ہو

O

کھڑے ہوئے تھے تباہی کے اِس دہانے پر
قیامت آ کے ٹھہر جائے گی زمانے پر

کسی کی جان پہ کچھ فرق بھی نہیں پڑتا
کہ، کون بچ گیا تھا ،کون ہے نشانے پر

گھڑی میں خاک اڑی تھی اسی پتنگے کی
ہزار شمعیں جلیں جس کو آزمانے پر

لبوں سے پھوٹی مہک سے بھری ہوئی مسکان
تمام شہر میں چرچے ہیں دل لگانے پر

وہ جانے کیا تھی اجازت کہ جو رہی درکار
کھڑی ہوئی ہوں میں حیران اس بہانے پر

O

یہ جو تہمت ہے میرے نام کے ساتھ
جلتی ،بجھتی ہے دن کے ،شام کے ساتھ

گر گئی اینٹ ، اینٹ مٹی پر
ہم بمشکل کھڑے تھے بام کے ساتھ

ہم بھی آنکھوں میں اشک بھرتے رہے
ہر محرم میں ہر امام کے ساتھ

خود بھی میں دَب گئی تھی ملبے میں
دل کی بستی کے انہدام کے ساتھ

□

کون سی بات کی تلاش میں لوگ
چل پڑے ہیں خیالِ خام کے ساتھ

زندگی دُھوم ، دھام سے جی کر
ہم بھی جائیں گے اہتمام کے ساتھ

بڑھتا جانے لگا سرورِ غم
میکدے میں ہر ایک جام کے ساتھ

میں وہ شے ہی نہیں ہوں ، رخشندہؔ!
جس کو لے جائے کوئی دام کے ساتھ

O

کہاں کہاں سے بہم کیجئے گا سُکھ یارو
کہ اس بدن کو لگے ہیں ہزار دُکھ یارو

اگر خیال ہے اتنا مری اداسی کا
تو پھر دکھا کے چلے جاؤ اپنے مُکھ یارو

O

اپنی فطرت میں بے درد ہی ہوتے ہیں
جن کے ہاتھ ہمیشہ سرد ہی ہوتے ہیں

لمحوں کو الماری میں محفوظ رکھیں!
پاؤں میں آ جائیں تو گرد ہی ہوتے ہیں

موسم کے سو رنگ سفید اُداسی میں
گرنے والے پتے زرد ہی ہوتے ہیں

ان کو رونا بھی مشکل سے آتا ہے
ایسے پتھر دل تو مرد ہی ہوتے ہیں

بڑی ہے جیسے گھر میں تُو بھی رخشندہؔ
حصے میں اشجار کے درد ہی ہوتے ہیں

O

جب تمہارے نگر سے نکلے تھے
زندگی کے سفر سے نکلے تھے

سبز مٹی نے کھینچا اپنی طرف
وُسعتِ بحر و بر سے نکلے تھے

لوٹ جانے کے راستے مسدود
پاؤں جیسے ہی در سے نکلے تھے

کتنی لِکھیں کہانیاں اب تک
کب وہ قِصّے نظر سے نکلے تھے

ہم تو تفریح کے ارادے سے
صاحبو اپنے گھر سے نکلے تھے

اس لئے بھی تھکن ہے رخشندہؔ
آپ مشکل ڈگر سے نکلے تھے

O

تیر جب اپنے نشانے پہ لگانے آئے
یہ بھی ممکن ہے کہ ہرنی کو بچانے آئے

اِتنی دوری سے کہاں ٹھیک نظر آتا ہے
بام پر چاند ہمیں چہرہ دکھانے آئے

تنگ گلیوں کی طرح دل بھی کُشادہ نہ رہے
گاؤں سے شہر میں روزی نہ کمانے آئے

بسترِ مرگ سے اُٹھے تو کئی روز ہوئے
مجھ سے ملنے وہ کسی اور بہانے آئے

پُشت پیچھے کا جو منظر ہے وہ اوجھل ہی رہا
درمیاں آنکھ کے گُم گشتہ زمانے آئے

تُجھ سا معصوم کہیں دیکھا نہیں، رخشندہؔ!
دل ہٹے پیچ سے، تب عقل ٹھکانے آئے

O

اجنبی شخص دیکھا بھالا ہے کیا
عام لگتا ہے یا نرالا ہے کیا

عالمِ خوف میں ہے خود معمار!!
پکّی چھت کو گرانے والا ہے کیا

کیوں مرا ہاتھ چہرے پر رکھا
روئی کا ایک نرم گالا ہے کیا؟

داستانوں میں ذکر آیا نہیں!
بے اثر درد تُو نے پالا ہے کیا

□

اپنے قد کاٹھ پر نظر نہیں کی
عکس گڑیا کا ہی سنبھالا ہے کیا؟

تُجھ میں وہ پہلے والا حسن نہیں !!
تُو نے دل سے مجھے نکالا ہے کیا؟

قید سے کیوں رہائی ملتی نہیں
بازوؤں کا حسین ہالہ ہے کیا؟

اے ستارہ شناس کیا ترے پاس
دُور بیں جیسا کوئی آلہ ہے کیا

پُھول کی فکر ہو رہی ہے مجھے
چاند کی سمت اسے اچھالا ہے کیا

O

مرے ہی نام نہ دام و درہم کرو لڑکی
یہ بے حسابی محبت کی کم کرو لڑکی

کہیں میں ڈوب نہ جاؤں محبتوں کے بیچ
نہ شدتوں سے مری چشم نم کرو لڑکی

ہر ایک لمحہ یہ پیشانی بھی ہے سجدہ ریز
دعائیں کرتی ہوں پل ، پل نہ غم کرو لڑکی

میں اپنے چارستونوں کے ساتھ زندہ ہوں
سو اک بھی چھوٹ نہ جائے، بہم کرو لڑکی

بھلائی پیڑوں کی صورت صحن میں اُگتی ہے
مہک کو گوشوں میں ہر وقت ضم کرو لڑکی

میں بیچ باغ کے، دیوانہ وار غنچوں میں
اسی طرح سے کروں رقص، دم کرو لڑکی

O

کیسے گزرے رات، دن، کیا عید پوری ہوگئی
آپ نے باندھی تھی جو اُمّید ، پوری ہوگئی

ہو نہیں سکتیں یہ تصویریں کبھی نعم البدل
کیا گلے ان سے ملیں، کیا دید پوری ہوگئی

ہم لکھاری لوگ ہیں ان روزناموں کی طرح
اک ادھوری بات کی، تردید پوری ہوگئی

پڑھ لیا اس نے مرے ہونٹوں پہ کچھ لکھا ہُوا
اک اشارے پر مری تائید پوری ہوگئی

میں بھی رخشندہؔ بدل لوں گی ادھورا فیصلہ
اس کے وعدے کی اگر تجدید پوری ہوگئی

O

خوف ڈر سر سے اتر نہیں سکتا
بھوت سر سے اتر نہیں سکتا

پیار لے کر اترتا ہے طائر
اپنے پر سے اتر نہیں سکتا

داغ دریا ہی دھوئے گا اب تو
چلّو بھر سے اتر نہیں سکتا

نیلا اک رنگ آسماں جیسا
میرے گھر سے اتر نہیں سکتا

بات کیا ہے کہ ایک بھی آنسو
چشم تر سے اتر نہیں سکتا

شہر پورا کھڑا رہے بے شک
قفل در سے اتر نہیں سکتا

چودھویں رات کا چڑھا دریا
شور و شر سے اتر نہیں سکتا

اس کو دل سے اتار رخشندہ
وہ نظر سے اتر نہیں سکتا

O

فقط ایک نیکی یہی ہے جو کہ سہی ٹھکانے میں لگ گئی
میں نحیف ماں کے یہ پاؤں ہر اک گھڑی دبانے میں لگ گئی

اُدھر ایک ایسی بھی ناؤ تھی ،کہ جو ڈوب جانے میں لگ گئی
وہ سمندروں کی عمیق موجوں کے بھید پانے میں لگ گئی

کبھی اس لگن میں محو رہی وہاں پتیاں تھیں گلاب کی
کبھی خوشبوؤں کے حصار سے ہی بدن چرانے میں لگ گئی

کئی ہاتھ میری طرف بڑھے نئے دوست ملتے رہے مگر
تھی پرانی میٹھی سی ایک دھن اُسے گنگنانے میں لگ گئی

رہے ہونٹ خاموش دیکھتے وہاں ضبطِ حال کی صورتیں
کہ جب انتہائی کڑے سمے آنکھ مسکرانے میں لگ گئی

تجھے پایا روبرو ایک دن مرے ہاتھ پاؤں تھے پھولے یوں
مرے ہاتھ گچھا تھا چابیوں کا اسے گھمانے میں لگ گئی

جو سکون ملتا ہے بیٹھنے سے گھنے درخت کی چھاؤں میں
وہ نصیب میں نہیں ہو سکا تو پرند اڑانے میں لگ گئی

یہ تمام وقت تو کٹ گیا تجھے پانے کھونے کی آس میں
کبھی خرچ کرنے میں تھی مگن ،تو کبھی کمانے میں لگ گئی

مجھے چاہیے تھا گزار لوں اسے چین سے، بڑے امن سے
یہ حیات کتنی حسین تھی جسے آزمانے میں لگ گئی

مرے ساتھ کے گئے پار پردیس اپنی اپنی مراد میں
یہ وطن مرا ہے یہیں چراغوں کی لو جگانے میں لگ گئی

سو پہنچ نہ پائی تھی وقت پر میں چلی تو راہ کے بیچ میں
مجھے ایک زخمی پڑا مِلا تھا اسے بچانے میں لگ گئی

مری شب اُدھار تھی چاند کی ، مری صُبح جیسے تھی آبِ زر
مرے سونے چاندی میں کھوٹ کو ،یہ ریا ملانے میں لگ گئی

O

عشق سر پر مرے سوار ہوا
بعد ہونے کے بار بار ہوا

ہم جدائی بیان کیسے کریں
تیر اس دل کے آر پار ہوا

اس مسّرت کا کوئی نام نہیں
تجھ سے بس سچّا سچّا پیار ہوا

بیچ دریا ہے، دائیں بائیں ہم
پنچھیوں سے نہ اُڑ کے پار ہوا

تیرے بن زندگی نہیں کٹتی
سانس لینا بھی ایک بار ہوا

نام لینا لبوں سے رخشندہَ
اک دکھی گیت کی پکار ہوا

O

جا معافی دی تجھے اور سزاوار نہ ہو
دل دکھاتے ہوئے اوروں کا گنہگار نہ ہو

ظلم کی جیت سے مظلوم کی بھی ہار نہ ہو
بے سبب میری طرف ایک کوئی وار نہ ہو

چاہیے دوست، زمانہ بھی جسے دوست کہے
نہ وہ دشمن ہو کہ جو صاحبِ کردار نہ ہو

ہم چلے آنکھوں میں اشکوں کے سپاہی لے کر
جنگ کی شرط یہ تھی ہاتھوں میں ہتھیار نہ ہو

کوئی بن مانگے محبت سے یہ جھولی بھر دے
اپنی غربت کا ضروری ہے کہ اظہار نہ ہو

O

طَلب خواہاں طلب پوری کریں گے
محبت سے نظر نُوری کریں گے

ہَری شاخیں شجر بھُوری کریں گے
وہ ظاہر عُذرِ مجبُوری کریں گے

کسی دن ختم کر سکتے ہیں خود کو
مگر از رُوئے مجبوری کریں گے

اگر ہے عشق میں لازم مشقت
تو پھر ہم جی سے مزدوری کریں گے

□

دِلوں کی شاہ راہوں کی طوالت
کہاں تک قُرب سے دُوری کریں گے

مہک ہر شخص سے آئے اُسی کی
کبھی حاصل وہ کستُوری کریں گے

اُسے ملنے خوشی سے آئیں گے ہم
نہ ظاہر کوئی مجبوری کریں گے

○

اک پیالہ اُٹھا کے رکھا ہے
اس میں شکر مِلا کے رکھا ہے

کاغذوں پر حسین اک خاکہ
تیرے جیسا بنا کے رکھا ہے

اے ملاقاتی! دیکھ تیرے لیے
پورا اک دن بچا کے رکھا ہے

نغمۂ زیست کو بسر کر کے
دیر تک گنگنا کے رکھا ہے

□

کمرہ ہوتا ہے دل کے اندر بھی
ہم نے کیا کیا چھپا کے رکھا ہے

بعد کا فیصلہ نجومی کرے
زائچہ اک بنا کے رکھا ہے

اک قلم دان میز پر اپنی
میر صاحب سے لا کے رکھا ہے

پھر سے تعمیر ہوں گے، رخشندہؔ!
پورا ملبہ گرا کے رکھا ہے

O

ماں نہیں تھکتی پیار دینے سے
وہ لہو کی بھی دھار دینے سے

اس کی جھولی کچھ اور بھرتی ہے
موتیوں جیسے ہار دینے سے

پیار الفت محبت اور چاہت
عمر بھر بار بار دینے سے

بوڑھی ماں ایسے ہی نہیں ہوتی
جان بچوں پہ وار دینے سے

ہم ہیں اولاد ، باز آتے نہیں
پھول ماؤں کو خار دینے سے

ہم بخیلی سے کام لیتے ہیں
اس کو بہتر دیار دینے سے

مُفت ملتا سکوں بھی لیتے نہیں
بال اُلجھے سنوار دینے سے

کھولتی ہے تہیں محبت کی
بوسے وہ بے شمار دینے سے

رات مجھے اچھی لگتی ہے

رات مجھے اچھی لگتی ہے